Al-Mahdi Research Journal (MRJ)
Vol 5 Issue 2 (Oct-Dec 2023)
HJRS HEC Journal Recognition System Category Y
ISSN (Online): 2789-4150
ISSN (Print): 2789-4142

The Pioneer Teacher of Reseaech: Hāfiz Mehmūd Sherānī

حافظ محمود شیرانی۔ تحقیق کے معلم اوّل

Dr. Nawaz Kawish
Chairman Department of Urdu, National College of Business Administration $ Economics Sub Campus Bahawalpur,nawaz.kawish7@gmail.com

Sbahat Arruj
PhD Scholar Urdu, National College of Business Administration $ Economics Sub Campus Multan, sbahat.arruj55@gmail.com

Mushtaq Ahmad
PhD Scholar Urdu, National College of Business Administration $ Economics Sub Campus Bahawalpur, mushtaqkharal46@gmail.com

Abstract:

Hafiz Mahmood Khan Shirani is considered the first mentor of research. He is an Indian researcher and poet during the British era. He is also the father of the great Urdu romantic poet Akhter Shirani. Mahmood Shirani started the tradition of research in Urdu. He did not write any book on research but presented a sketch for the coming researchers. He was in favor of internal evidence in research. Internal evidence means to collect evidence from outside to prove internal validity. His notable research works are Majmooai Naghz, Shahnama Fidosi, Aabe Hiyat, Shair ul Ajm, Khaliq Bari, and Prithvi Raj Rasa. In these works, he tried to prove otherwise the long-established beliefs of people. He edited some books and published them again with least errors. He reached the maximum primary and secondary sources to collect correct information. He did not rely on a single source but rather searched for the maximum possible sources. Hafiz Mahmood Sherani's research opened the way of research for the new researcher. After his work in Punjab main Urdu, the research work was done in Sindh main Urdu and Dakkan main Urdu. So Sherani is the pioneer in the field of research.

Keywords: Internal evidence, validity, primary source, secondary source

حافظ محمود شیرانی کو تحقیق کا معلم اول سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے تحقیق کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت عطا کی۔ آپ اردو میں تحقیق کے لیے روایت ساز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شیرانی صاحب کی تحقیقی زندگی کا آغاز ۱۹۲۰ سے شروع ہو کر زندگی کے آخری شام تک جاری رہتا ہے۔ انھوں نے اصول تحقیق پر اگرچہ کوئی کتاب نہیں لکھی، لیکن اصول تحقیق اور طریقہ کار کی تفصیلات ان کے مختلف مقالوں سے مرتب کی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے لیے جو خاکہ بنایا اور جس طرح اس میں رنگ آمیزی شروع کی تھی، اور جو طریقہ کار اختیار کیا تھا، اس کے بعد بھی اسی طریقۂ کار کی پیروی کی گئی۔

تحقیق کے طریقہ کار میں جو اجزا اہمیت کے حامل ہیں، ان میں ایک داخلی شواہد کا تعین بھی ہے۔ داخلی شواہد کا مطلب یہ ہے کہ کسی کتاب میں جو واقعہ بیان کیا جائے، اس وقت تک معتبر نہیں مانا جاتا، جب تک کہ دوسروں کی شہادت نہ مل جائے۔ شیرانی صاحب نے داخلی شواہد کو متعارف کرانے کے ساتھ داخلی شواہد کی بنیاد پر تحقیق کی روایت کو آگے بڑھایا۔

"شاہنامہ فردوسی" جو ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں فردوسی سے متعلق جو باتیں عام تھیں، شیرانی صاحب نے داخلی شواہد کی بنیاد پر حقیقت پر سے پردہ اٹھایا۔ انھوں نے 'شاہنامہ فردوسی' سے متعلق باتوں کو 'فردوسی پر چار مقالے' میں پیش کر کے وہ کارنامہ انجام دیا ہے، جس سے اہل ایران بھی قاصر تھے۔

CC BY

آپ کے کارناموں میں قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ **"مجموعۂ نغز"** بھی ہے۔ "مجموعۂ نغز" کا واحد نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں محفوظ تھا۔ آپ نے اسے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ ترتیب دے کر شائع کیا۔ "مجموعۂ نغز" کی روشنی میں آپ نے محمد حسین آزاد کی کتاب **"آب حیات"** میں جہاں جہاں لغزش ہوئی تھی، اس کی نشاندہی کی ہے۔ "مجموعۂ نغز" کی ترتیب آپ کا وہ لازوال کارنامہ ہے، جس کو اگر آپ نے انجام نہیں دیا ہوتا تو شاید "مجموعۂ نغز" دنیا سے ختم بھی ہو گیا ہوتا۔

آپ نے شبلی کی **"شعر العجم"** کے جواب میں **"تنقید شعر العجم"** لکھ کر یہ واضح کیا کہ شبلی نے سوانح سے متعلق جو تذکرہ لکھا ہے یا تاریخ کے بارے میں جو بتایا ہے ان میں تحقیق سے متعلق اصول کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ آپ نے **"تنقید برائے آب حیات"** لکھ کر یہ واضح کیا کہ جس طرح شبلی "شعر العجم" میں سوانح سے متعلق معتبر نہیں ہیں، اسی طرح محمد حسین آزاد بھی "آب حیات" میں معتبر نہیں ہیں۔

امیر خسرو کی طرف منسوب **"خالق باری"** کے بارے میں پہلی بار آپ نے داخلی شواہد کی بنیاد پر یہ بتایا کہ یہ کتاب امیر خسرو کی نہیں ہے بلکہ ضیاء الدین خسرو کی ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس کتاب میں تمباکو کا ذکر آیا ہے، جب کہ تمباکو پرتگالیوں کے ذریعے اکبر کے زمانے میں ہندوستان آیا۔

"پرتھوی راج راسا" کے بارے میں یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب چند بردائی کی تصنیف ہے جو دہلی کے راجہ پرتھوی راج چوہان کا درباری شاعر تھا۔ اسی بنا پر اس کتاب کو دیسی زبانوں میں سب سے قدیم کتاب کا درجہ دیا جاتا ہے۔ آپ نے داخلی شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کیا کہ یہ کتاب بہت بعد کی ہے یعنی سولھویں صدی کے نصف آخر کی یادگار ہے۔

حافظ محمود شیرانی دراصل بے لاگ، بے لوث اور غیر جانب دار محقق تھے۔ انھوں نے پہلی بار تحقیق کو اس طریقہ کار سے روشناس کرایا۔ درحقیقت ان میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک محقق کے لیے لازمی خیال کی جاتی ہیں۔ حافظ محمود شیرانی کے بارے میں **انجم**[1] رقم طراز ہیں:

> **"قاضی عبدالودود سے قبل اردو محققین میں اہم ترین نام حافظ محمود شیرانی کا ہے۔ حافظ محمود شیرانی ۵-اکتوبر ۱۸۸۰ کو اور قاضی عبدالودود ۸ مئی ۱۸۹۶ کو پیدا ہوئے تھے۔ گویا حافظ محمود شیرانی قاضی صاحب سے پندرہ سولہ سال بڑے تھے۔ شیرانی مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ شیرانی صاحب نے تحقیق سے متعلق جو علوم حاصل کیے تھے، وہ کسی اور محقق کو نصیب نہیں ہوئے"**

لسانی تحقیق سے متعلق آپ کا بے مثال کارنامہ **"پنجاب میں اردو"** ہے۔ اس کتاب میں آپ نے اردو زبان کی قدامت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص ان مسائل پر جن کی رو سے پنجاب کو اس زبان کی ابتدا اور اس کی نشو نما کا گہوارہ مانا جا سکے۔ چوں کہ ہمارا ایک اہم موضوع بھی یہی ہے اس لیے ذیل میں تفصیلاً ذکر کیا جا رہا ہے۔

حافظ محمود شیرانی صاحب پنجاب میں اردو زبان کے ادب کا ارتقائی مطالعہ کر رہے تھے کہ نصیر الدین ہاشمی صاحب کی کتاب **"دکن میں اردو"** شائع ہوئی اس کتاب میں اگرچہ یہ دعوی تو موجود نہیں ہے کہ اردو زبان دکنی سے نکلی ہے یا پھر دکن میں پیدا ہوئی اور دکن سے پورے ہندوستان میں پھیلی لیکن اس کتاب کو پڑھنے کے بعد کچھ ذہنوں میں جو علم لسانیات سے واقفیت نہیں رکھتے تھے انھوں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ چوں کہ اردو ادبیات کی ابتدا دکن سے ہوئی ہے اس لئے اردو زبان کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔ اس دور میں کئی ایک مصنفین نے (جو کہ ماہر لسانیات نہیں تھے) اردو اور پنجابی زبان کی قربت کی باتیں شروع کی ہوئی تھیں اس بحث میں علامہ اقبال تک شریک ہوئے۔ ایسے میں پروفیسر مسعود حسین خان کی کتاب **"مقدمہ تاریخ زبان اردو"** منظر عام پر آئی جس میں ہریانوی کو اردو زبان کا ماخذ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی **مسعود**[2] کی اسی کتاب سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> **"ہندو آریائی لسانیات میں اس عہد کا سب سے بڑا کارنامہ گریرسن کا عظیم الشان "لسانی جائزہ ہند" ہے۔ گریرسن نے سب سے پہلے با تفصیل ان قیاس آرائیوں کا ازالہ کیا ہے جو ہماری زبان کے کینڈے کے متعلق بغیر سوچے سمجھے کی گئی تھیں اس نے ہند آریائی زبان کے تاریخی تسلسل کی نشان دہی کی اور جدید آریائی زبانوں کے باہمی رشتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی"۔**

گریرسن کی لسانی تحقیقات اردو زبان کے متعلق حرف آخر کا حکم نہیں رکھتیں۔ شیرانی کی محققانہ نظر نے یہ فوراً بھانپ لیا۔ شیرانی کو اپنے نقطہ نظر کے لیے اشارہ خود گریرسن کی تحریروں میں مل گیا تھا جس نے اردو کے "پنجابی پن" پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ اس دور میں اردو ادبی لسانیاتی تحقیق کا سب سے بڑا کارنامہ پروفیسر شیرانی کی **"پنجاب میں اردو" (۱۹۲۸ء)** نے جو ترتیب اور لسانی اصولوں کے اعتبار سے مکمل نہ سہی، تحقیق کے اعتبار سے گراں قدر تصنیف ہے۔ خصوصاً پنجاب میں اردو ادبیات کے ارتقائی مطالعہ کے حوالے سے یہ ایک بیش قیمت تحقیقی کام ہے۔ **زور**[3] پروفیسر شیرانی کی کتاب **"پنجاب میں اردو"** پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

CC BY

"پروفیسر حافظ محمود شیرانی اسلامیہ کالج لاہور نے اپنی گراں قدر کتاب "پنجاب میں اردو" میں اردو اور پنجابی دونوں سے متعلق بعض نہایت اہم اور دل چسپ لسانی پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ ان کے اہم لسانی دلائل (جن کی بنا پر وہ اردو کی یہ نسبت برج بھاشا کے پنجابی سے زیادہ قریب اور مشترک قرار دیتے ہیں) دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی اور اردو دونوں ایک ہی اصول کے تحت لسانی اور نحوی ارتقاء پاتے رہے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس سلسلے میں کئی دل چسپ مثالیں اور حوالے پیش کئے ہیں۔ ان کی دوسری دلیل سے واضح ہوتا ہے کہ اردو میں چند اجزا ایسے ہیں جن کا حوالہ سوائے پنجابی کے کسی اور زبان میں نہیں مگر یہ خصوصیتیں براہ راست تعمیر زبان سے تعلق رکھتی ہیں۔ موجودہ اردو میں ان کا کوئی وجود نہیں وہ صرف قدیم رکنی کارناموں میں نظر آتی ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے جو مواد پیش کیا ہے نہایت ہی مفید اور اردو کی تخلیق و آغاز سے متعلق مفید نتیجوں پر پہنچنے کے لیے کافی معد و معاون ہو سکتا ہے"۔

اردو کے آغاز کے متعلق پیش کئے گئے نظریوں کا جائزہ **چین**[4] نے اپنے ایک مضمون میں لیا ہے۔ میر امن، آزاد، نصیر الدین ہاشمی کے نظریوں کا ذکر کرنے کے بعد شیرانی کے نظریے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ محمود شیرانی کا نظریہ زیادہ قابل غور ہے۔ انہوں نے **"پنجاب میں اردو"** کے عرض حال میں لکھ دیا ہے کہ ان سے پہلے شیر علی خان سرگوش نے اپنے تذکرہ اعجاز سخن میں اردو کے آغاز کو سرزمین پنجاب سے منسوب کیا کسی نے اس تذکرے کو دیکھنے کی زحمت نہ کی بجز ڈاکٹر عبد الغفار شکیل کے انہوں نے خبر دی کہ جو نظریہ شیرانی سے منسوب ہے دراصل ان سے پہلے اعجاز علی سرخوش بیان کر چکے تھے۔

شیرانی[5] نے اس نظریہ کو مفصل اور مدلل پیش کر کے پایہ اعتبار کیا۔ ان کی بیش بہا تصانیف **"پنجاب میں اردو"** کے دیباچے میں ان کے نظریے کا خلاصہ کچھ اس طرح ملتا ہے۔ "ہم اردو کے آغاز کو شاہ جہان یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں لیکن یہ زبان اس زمانہ سے بہت قدیم ہے بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود انہی ایام سے ماننا ہو گا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔۔۔۔ یہ بیانات جو ہمارے تذکرہ نگار ایک دوسرے سے نقل کرتے آئے ہیں حقیقت سے بہت دور ہیں ہمیں ان کو صرف بزرگوں کے تبرک کے طور پر تسلیم کر ناچاہیے ورنہ کیا اکبر اور شاہ جہان سے پہلے دلی نہیں تھی یا ہندو مسلمان نہ تھے یا لوگ سودا سلف نہیں لیتے تھے یا مختلف قومیں ایک ساتھ رہ کر کاروبار کرنا نہیں جانتی تھیں پھر اکبر شاہ جہان کے عہد کے ساتھ کیا خصوصیت ہے کہ اردو کی بنیاد رکھی جائے۔ **اصل یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑھنی شروع ہو گئی ہے جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر توطن اختیار کر لیا ہے۔"**

پروفیسر شیرانی کی مذکورہ رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے **سبزواری**[6] اس طرح خیال اظہار کرتے ہیں۔ "مسلمان اہل علم نے اردو کا سنگ بنیاد دہلی میں رکھ کر اس کی نشو نما غوریوں کی عہد میں رکھا یا اور شاہجہان کے عہد میں پروان چڑھایا مولانا شیرانی پنجاب کو اس کا مولد بتاتے ہیں اور غزنویوں کے عہد میں اسے پھولتا پھلتا دکھاتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ مولانا شیرانی عام مسلمان اہل علم کے خلاف اردو کی قدامت کے قائل ہیں وہ اس کے آغاز کو مغلوں یا خلجیوں سے پیچھے پلٹا کر غزنویوں کے عہد تک لے گئے"۔

پروفیسر شیرانی اردو کے آغاز کے متعلق مزید لکھتے ہیں "کہا جاتا ہے کہ مغربی ہندی جس کی برج بھاشا، ہریانی، راجستھانی، پنجابی اور اردو شاخیں ہیں قدیم پراکرت سوراسینی (شورسینی) کی یادگار ہے۔ لیکن جس زبان سے اردو ارتقاء پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی ہے وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ ہمیں یہ تحقیق معلوم نہیں کہ جب مسلمان دہلی میں وارد ہوئے اس وقت اس علاقہ میں کیا زبان بولی جاتی تھی۔ آج دیکھا جاتا ہے کہ دہلی کے قریب تین زبانوں یعنی ہریانوی، برج اور راجستھانی کا سنگم ہوتا ہے اور گریرسن نے تو صاف دہلی کو ہریانوی زبان کے علاقے میں شامل کر دیا ہے مگر راقم (محمود شیرانی) کی رائے میں ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اردو ہے یعنی وہی اردو ہے۔ جو گیارھویں صدی ہجری میں بھی خود دہلی میں بھی بولی جاتی ہے۔ اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے اگر ہم اس کو اردو نہ مانیں تو اردو کی شاخ ماننے میں تو ہمیں عذر نہیں ہونا چاہیے۔ بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے وقت کون سی زبان بولی جاتی تھی؟ یا وہ راجستھانی ہو گی یا برج؟ اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔

مسعود[7] مزید لکھتے ہیں:

"اپنے نظریے کی تائید میں شاید شیرانی کی سب سے کمزور دلیل یہی ہے کہ پنجابی مسلمانوں کی آمد سے قبل کے دواب کے بالائی حصوں کی زبان برج بھاشا تھی۔ حالاں کہ اس وقت تک برج کا ارتقاء بھی پورے طور پر نہ ہو سکا تھا۔ اس کے ثبوت میں وہ فتح دہلی کے ساڑھے تین سو برس کے دو مصنفوں (شیخ عبد القدوس گنگوہی اور مخدوم بہاالدین) کی تحریروں کا حوالہ دیتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے اور یہ کہ اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں"۔

سعود حسین خان نے اپنی کتاب مقدمہ تاریخ زبان اردو میں پروفیسر شیرانی کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے پروفیسر شیرانی نے اپنی تصنیف **"پنجاب میں اردو"** میں بعض تار یخی مفروضات کی بناپر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کھڑی اور ہریانی پنجابی مسلمانوں کے داخلہ دہلی کے بعد ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ **شیرانی**[8] کی کتاب سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> **"چوتھی صدی کے اواخر میں محمودی حملوں کا آغاز ہوتا ہے اور تمام پنجاب آل غزلہ کے زیر اقتدار آجاتا ہے۔ آل غزلہ کی حکومت تقریباً ایک سو ستر سال تک رہتی ہے۔ اگر آل غزلہ سے بیشتر مسلمانوں کو کسی ہندی زبان کے اختیار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تو اس عہد میں جو خاصا دراز ہے وہ پنجاب میں کوئی نہ کوئی زبان سرکاری، تجارتی و معاشرتی اغراض سے اختیار کر لیتی ہیں جب گوغوریوں کے عہد میں جب دار سلطنت لاہور سے دہلی جاتا ہے۔ اسلامی فوجیں اور دوسرے پیشہ ور اپنے ساتھ دہلی لے جاتے ہیں۔ دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانو ں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بناپر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل اختیار کر لیتی ہے"۔**

اس دعوے سے صرف اتنا کہہ دیناہی کافی ہے کہ مسلمان پنجاب میں جو زبان اختیار کرتے ہیں اور جس کو اسلامی فوجیں اور دوسرے پیشہ ور اپنے ساتھ دہلی لے جاتے ہیں وہ شورسینی اب بھرنش اور اس کی عوامی شکل مغربی ہندی ہے۔ جس میں سے جدید ہند آریائی زبانوں کے بیچ پھوٹنا شروع ہو گئے تھے اس وقت تک برج بھاشا کا کوئی واضح روپ متعین نہیں ہوا تھا اس لیے یہ کہنا تو مناسب نہیں کہ برج کے اثرات سے ترمیم ہوئی ہاں یہ کہنا درست ہے کہ اردو کی نمایاں شکل دہلی جاکر ہی سامنے آئی۔ **شیرانی**[9] صاحب خود لکھتے ہیں۔ "پنجاب پر غوریوں کے حملے ۱۱۶۷ء سے شر وع ہو جاتے ہیں۔ ۱۱۹۳ء میں بالا آخر محمود غوری دہلی کے آخری ہندو سمراٹ پر تھوی راج کو شکست داش دینے کے بعد دہلی اور اجمیر پر قابض ہو جاتا ہے۔ دہلی اس کے بعد ہندوستان کا دار السلطنت قرار پاتا ہے"۔ پروفیسر شیرانی نے لاہور سے دہلی کو پایہ تخت کے اس انتقال پر بہت زور دیا ہے حالانکہ یہ محمد تغلق کے انتقال پایہ تخت کی طرح نہ تھا جس نے دہلی اور اس کے اطراف کی بیشتر آبادی کو یک لخت گرم سفر ہو جانے کا حکم دیا ہے۔ لاہور اس کے بعد بھی پنجاب کے صوبہ کا صدر رہا۔ تاریخ سے اس کی شہادت نہیں ملتی کہ لاہور کی آبادی نے کبھی بھی بڑے پیمانے پر دہلی کو ہجرت کی ہو۔ مسعود صاحب کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ لاہور سے دہلی کو پایہ تخت کا انتقال محمد تغلق کے انتقال پایہ تخت کی طرح نہ تھا اور یہ بھی درست کہ دہلی بسنے کہ یہ معنی نہ تھے کہ لاہور اجاڑ دیا گے تھا مگر شیرانی کے مندرجہ ذیل بیانات بھی حقیقت پر مبنی نظر آتے ہیں۔

"خطہ پنجاب کے باشندے اپنی قد و قامت اور طبعی جرات کی بناپر فوجی خدمات کے لیے بہت موزوں اور مناسب ہیں اس لئے سلطان محمود نے جو فوج ہندووں سے انتخاب کی وہ تمام پنجا بی تھی۔ اس کے جانشین بھی پنجابی فوجیں رکھتے تھے جب دہلی کی طرف مراجعت ہوئی ہے تو ایک بڑی تعداد پنجابیوں کی بھی تھی۔ جب معزالدین اور اس کے والی قطب الدین ایبک نے چند سال کے عرصے میں اجمیر، بائسی، سمرستی، کہراچی، میرٹھ، دہلی، بدایوں، قنوج، بنارس، مہروالا تھنیکر، گوائیر کالتجر، اودھ اور مالود فتح کرلے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نئے علاقے کے انتظام کے لئے ان کو کس قدر آدمی درکار ہوئے ہوں گے کیوں کہ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر شہر میں ان کو اپنی چھاونی رکھنی پڑی ہو گی، چاروں طرف طاقت ور ہندو راجہ موجود تھے جن کو قدرتاً مسلمانوں سے عداوت تھی۔ اس لیے ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان ایام میں شمال سے لوگ بڑی تعداد میں ہجرت کر کے ہندوستان کی طرف چلے گئے ہیں اور ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ لاہور چوں کہ پرانا دار السلطنت تھا اس لئے ضروری ہوا کہ یہاں کے لوگ تبدیلی دار السلطنت کے وقت بہ تقریب ملازمت و تجارت و دیگر خدمات زیادہ تعداد میں جائیں۔ قطب الدین ایبک کے ساتھ جو لوگ ہجرت کر گئے دہلی آ گئے ہیں اگرچہ یوں تو ان میں مختلف اقوام شامل تھیں مثلاً ترک (جو برے عہدوں پر ممتاز تھے) خراسانی جو مناسب دیوانی پر سرفراز تھے۔ خلجی، افغان اور پنجابی لیکن ان میں زیادہ تعداد موخر الذکر کی تھی جو فوجی اور دیوانی خدمات کے علاوہ زندگی کے اور پیشوں پر بھی متصرف تھے۔ اس سے قبل اشارہ کیا جاچکا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندووں کے اختلاط سے اگر کوئی زبان نہیں بنی تو غز نوی دور میں جو ایک سو ستر سال پر حاوی ہے ایسی مخلوط یا بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے، اردو چوں کہ پنجاب میں بنی ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجود پنجابی کے مماثل ہو یا اس کے قریبی رشتے دار ہو۔ بہر حال قطب الدین کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوتے ہیں جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں اور سا تھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں اور جس کو قیام پنجاب کے زمانے میں وہ بولتے رہے"۔

سرزمین پنجاب کے لسانی اثرات کو پروفیسر مسعود حسین خان بھی ماننے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ چناں چہ لکھتے ہیں۔ بازار اور لشکر میں نہ تو ترکی، فارسی کو دخل حاصل تھا اور نہ برج بھاشا کو ۔ سلاطین دہلی کے ابتدائی عہد میں چونکہ فوج میں پنجابیوں کی کثیر تعداد تھی اس لیے سرزمین پنجاب کے لسانی اثرات حاوی تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ابتدائی سلاطین دہلی کے عہد کی حیثیت ایک فوجی چھاونی سے زیادہ نہیں تھی اور اسکا اعتراف مسعود صاحب نے بھی کیا ہے۔ لیکن مسعود صاحب نے کہیں اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ مسلمانوں کی فتح دہلی کے وقت جو لوگ (خواہ ان کی تعد اد کچھ بھی رہی ہو) پنجاب سے مسلم حکمرانوں کے ساتھ دہلی گئے وہ کون سی زبان بولتے ہوئے گئے؟ دوسری بات یہ کہ خود ان کے کہنے کے مطابق چوں کہ فوج میں پنجابیوں کی کثیر تعداد تھی اس لیے سرزمین پنجاب کے لسانی اثرات حاوی تھے۔ تیسری بات یہ کہ ابتدائی سلاطین دہلی کے عہد میں دہلی کی حیثیت ایک فوجی چھاونی سے زیادہ نہیں تھی اور جو ہریانہ کے علاقے میں تھی تو پھر وہ کون سے حالات تھے جن کی بناپر مسلم حکمرانوں کا قافلہ اس بات پر مجبور ہوا کہ وہ اپنی زبان چھوڑ کر دہلی کی زبان اختیار کرے۔

CC BY

پروفیسر مسعود حسین خان شیرانی کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "پروفیسر شیرانی نے پنجاب میں اردو لکھتے وقت اس لسانی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کہ راجھستانی اور گجراتی کی طرح پنجابی کا تعلق بھی کسی زمانے میں زبانوں کی بیرونی شاخ سے تھا جس کے اثرات کی نشان دہی آج بھی کی جاسکتی ہے بعد کو اس پر اندرونی زبان کا اس قدر گہرا اثر پڑا کہ اس کی صورت بدل گئی۔ مذکورہ بالا اعتراض کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جدید ہند آریائی زبانوں کی تقسیم کے سلسلے میں انھوں نے گریرسن کی اندرونی اور بیرونی تقسیم کو غلط قرار دیتے ہوئے لکھا ہے"۔

چناں چہ ہمیں یہاں گریرسن سے اختلاف کرتے ہوئے چٹرجی کی اس رائے میں متفق ہونا پڑتا ہے کہ اندرونی بیرونی زبانوں کی یہ تقسیم لسانی اعتبار سے اتنی ہی مہمل ہے جتنی کہ تاریخ استدلال ہے۔

قدیم دکنی اور پنجابی کے مذکورہ بنیادی اختلافات کے باوجود پروفیسر شیرانی کے اس دعوی میں کافی حد تک صداقت ملتی ہے کہ قدیم دکنی پنجابی کی مماثل ہے۔ اب سبز واری[9] کے تین بیانات ملاحظہ فرمایئے۔

i. **"یہ عجیب بات کہ اردو کی تائید کے بارے میں اردو میں دو نظریے بلند آہنگی کے ساتھ پیش ہوئے اور دونوں پنجاب سے متعلق ہیں۔ مولانا آزاد نے فرمایا، اردو برج سے نکلی۔ اس کے مقابلے میں مولانا شیرانی کی آواز آئی اردو پنجابی کی بیٹی ہے"۔**

ii. **"اب تیسرے نظریے کو لیجیے کہ اردو پنجابی سے ماخوذ ہے مولانا شیرانی مرحوم کی قابل قدر کتاب "پنجاب میں اردو" کی ثقافت کے بعد سے یہ نظریہ زیادہ زور پکڑ گیا ہے"۔**

iii. **"اردو اصلاً پنجابی ہے اس کا بڑا اور اہم سرمایہ پنجابی سے لیا گیا۔ یہ مولانا حافظ محمود خان شیرانی کا نظریہ ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے پنجابی اور اردو کی نسلی مشابہتیں دکھا کر یہ نتیجہ نکالا کہ اردو پنجابی سے ترقی پا کر وجود میں آئی"۔**

ان باتوں میں شیرانی نے ہرگز نہیں کہا کہ اردو پنجابی کی نکلی ہے اور نہ ہی یہ کہا کہ اردو پنجابی سے ماخوذ ہے۔ شیرانی نے اردو اور پنجابی کی مشترکہ خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا، اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔

آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر شیرانی نے اردو کا آغاز کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے اہم نکات یہ ہیں۔

- **اس کا وجود انھیں ایام سے ماننا ہو گا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔**
- **جس زبان سے اردو ارتقاء پاتی ہے وہ نہ برج ہے اور نہ ہریانی اور نہ قنوج ہے۔ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔**
- **یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے۔**
- **دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے وقت راجھستانی بولی جاتی تھی یا برج۔**
- **اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے۔**
- **اردو چوں کہ پنجاب میں بنی ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ یا تو پنجابی کے مماثل ہو یا اس کی قریبی رشتہ دار ہو۔**
- **قطب الدین کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوتے ہیں جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں اور جس کو قیام پنجاب کے زمانے میں وہ بولتے رہے۔**
- **اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔**

ماحصل

اردو زبان و ادب کے عظیم محققین میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا نام ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ شیرانی صاحب کی تحقیق اگرچہ یورپی تحقیق کے جدید اصولوں میں نہیں لیکن اردو زبان و ادب کے حوالے سے ان کا نام یقیناً ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ حافظ محمود شیرانی کو زیادہ شہرت ان کے ایک لسانی دعوی نے دی، ان سے منسوب کر کے لوگ یہ کہتے ہیں، اردو زبان پنجابی سے ماخوذ ہے یا آسان لفظوں میں اردو پنجابی زبان سے نکلی ہے، اس دعوی میں حقیقت ہے یا نہیں لیکن بلا تحقیق اس کی حمایت اور اس کی مخالفت میں بے شمار صفحات سیاہ کئے گئے لیکن ماسوائے شوکت سبزواری کے کسی نے بھی اس کا حقیقی اور بے تعصب جائزہ نہیں لیا، شیرانی صاحب کے تحقیقی کام کی وقعت اور اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن شیرانی صاحب ماہر لسانیات نہیں تھے اور نہ ہی انھوں نے کہیں سے لسانیات کی بنیادی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی ساری تحقیق لفظوں کی تلاش و تقابل میں نظر آتی ہے۔

CC BY

ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ اردو جس زبان سے ارتقاء پاتی ہے وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی، دوسری جگہ وہ کہتے ہیں کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے۔ تیسری جگہ کہتے ہیں کہ اردو پنجاب میں بنی اور وہاں سے مسلمانوں کے ساتھ دہلی گئی۔ ان بیانات سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ان کا ذہن اس سلسلے میں واضح نہیں۔ اس لیے متضاد باتیں ایک ساتھ کہہ رہے ہیں۔ دراصل ان کے پیش نظر اردو زبان کی حقیقت کا کھوج لگانا نہیں تھا بلکہ وہ اس کوشش میں تھے کہ پنجاب میں اردو زبان و ادب کے ذخیرہ کو جمع کریں۔ اس کام کو کرتے کرتے جب انھوں نے دیکھا کہ اردو کا مولد کچھ دوسرے علاقوں کو بتایا جارہا ہے تو انھوں نے بھی اپنی تحقیق میں سے زبان کا موازنہ پنجاب میں بولی جانے والی زبان سے کرنا شروع کیا، اردو اور پنجابی دونوں پر فارسی اور عربی کے اثرات موجود ہیں اور ذخیرہ الفاظ میں بیشتر حصہ اس لیے مماثلت رکھتا ہے کہ دونوں زبانوں نے یہ حصہ فارسی اور عربی سے لیا ہے۔ شیرانی صاحب اس نقطے کو نہ سمجھ سکے اور اپنا سارا زور انھوں نے الفاظ کی مماثلت و قربت ثابت کرنے میں صرف کر دی۔ اور بعد کے نام نہاد نقادوں نے علم لسانیات کو سمجھے بغیر ان کے نظریے کی حمایت شروع کر دی۔ اردو زبان اور پنجابی زبان کا ایک رشتہ موجود ہے کہ یہ دونوں زبانیں صدیوں سے ایک ہی خطے میں بولی جارہی ہیں۔ اور ان دونوں زبانوں نے فارسی اور عربی کی توسط سے ایک دوسرے سے استفادہ بھی کیا ہے اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوئی ہیں۔ خصوصاً صوفیائے کرام نے جو زبان تبلیغ کے لیے استعمال کی وہ اردو اور پنجابی کی ملی جلی شکل تھی۔

اردو زبان پر اگر توں سے ترقی کر کے اب بھر نشوں سے بننے والی اس زبان کی جدید شکل ہے جو پنجاب سے لے کر دہلی تک عوام بولتی تھی۔ صوفیا و مبلغین نے اس بولی میں بیرونی اثرات یعنی فارسی اور عربی کے الفاظ اور تراکیب شامل کئے اور کئی صدیوں کے بعد موجودہ شکل دی۔ اس بولی کی خام صورت دکن میں دکھائی دیتی ہے۔ پھر شمالی ہند میں خواص کی توجہ اور لکھنو میں دوبار شعرا کی مسلسل محنت نے اسے ایک مکمل ادبی زبان کی صورت دی اور انگریزوں نے فارسی دشمنی کی بنا پر اس کی سرکاری سرپرستی کی اور اسے درسی کتابوں کی زبان بنا دیا۔ یوں یہ بولی قریب و جوار کی دوسری بولیوں سے جن میں پنجابی بھی شامل ہے زیادہ ترقی کرتی چلی گئی اور آخر کار پورے خطے کی لینگوا فرینکا کی شکل اختیار کر گئی۔ اس حقیقت کو ماننے کی جگہ مختلف ادبی تاریخ نویسوں نے اس زبان کو اپنے خطے کی زبانوں سے منسوب کرنا شروع کیا اور ان میں سب سے اہم نام حافظ محمود شیرانی کا ہے۔ انھوں نے صرف اسی بات کو بنیاد بنا کر (دہلی سے پہلے مسلمان افواج لاہور میں رہے اور وہاں سے دہلی گئے) یہ کہا کہ اردو زبان دہلی سے پہلے لاہور میں بولی جاتی تھی اور لاہور کی زبان چوں کہ پنجابی تھی اس لیے اردو زبان بھی پنجابی سے ماخوذ سمجھی جانے کا نعرہ لگایا اور ان کے جواب میں ہر خطے اور علاقے کے لوگوں نے اردو کو اپنے خطے کی زبان اور اپنی زبان سے ماخوذ قرار دینا شروع کر دیا۔

یوں کسی نے کہا کہ اردو سندھی سے نکلی، کسی نے کہا کہ اردو گجراتی سے نکلی، اور کسی نے کہا کہ اردو کشمیری سے نکلی ہے، کسی نے کہا کہ اردو پشتو سے نکلی ہے اور کسی نے کہا کہ اردو ہندکو سے نکلی ہے۔ کیا ان سب کو یہ عالمگیر لسانی حقیقت معلوم نہیں تھی کہ کوئی بھی زبان کسی دوسری زبان سے نہیں نکلتی اس کی ایک مکمل شکل موجود ہے البتہ زبانیں ایک دوسرے کو کچھ دیتی اور کچھ لیتی ہیں اس لیے زبانیں زندہ ہیں۔

CC BY

حوالہ جات

ڈاکٹر خلیق انجم، س۔ن، قاضی عبدالودود تحقیقی و تنقیدی جائزے، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ص ۱۴۰

ڈاکٹر مسعود حسین، ۱۹۵۴ مقدمہ تاریخ زبان اردو، آزاد کتاب گھر، دہلی، ص ۸۷

محی الدین قادری زور، س۔ن، اردو کے آغاز کے نظریات، پ۔ن، ش۔ن، ص ۳۵

گیان چند جین، س۔ن، مشمولہ حقائق (مضمون)، پ۔ن، ش۔ن، ص ۳۸

حافظ محمود شرانی، ۱۹۲۸، پنجاب میں اردو، انجمن ترقی اردو، لاہور، ص ۱۷

ڈاکٹر شوکت سبزواری، ۱۹۶۰، داستانِ زبان اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی، ص ۶۵

ڈاکٹر مسعود حسین، ۱۹۵۴، مقدمہ تاریخ زبان اردو، آزاد کتاب گھر، دہلی، ص ۶۴

حافظ محمود شرانی، ۱۹۲۸، پنجاب میں اردو، انجمن ترقی اردو، لاہور، ص ۱۳

ڈاکٹر شوکت سبزواری، ۱۹۶۰، داستانِ زبان اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی، ص ۶۱